پرویز ہود بھائی انتہا پسندی پر رائے دیتے ہیں

'ہم سب' کے لئے خصوصی انٹرویو

عدنان کاکڑ: ملک میں انتہا پسندی کیوں پھیل رہی ہے؟ عدم برداشت کا رویہ کیوں پھیل رہا ہے؟

پرویز ہود بھائی: پہلے ایسے نہیں ہوتا تھا۔ میری پیدائش کراچی میں ہوئی۔ اور میرے سترہ اٹھارہ سال یعنی 1950ء سے لے کر 1968ء تک وہاں گزرے، اس زمانے میں ہمارے اطراف ہر قسم کے لوگ رہتے تھے۔ ان میں عیسائی بھی تھے، ایک آدھ ہندو بھی تھا اور پارسی تھوڑی دور رہتے تھے۔ سب کے ہاں آنا جانا ہوتا تھا۔ اور جب ان کے تہوار ہوتے تھے تو ان کے گھروں سے ہمارے گھر کوئی اچھی شے بھیجی جاتی تھی۔ جب ہمارے ہاں عید ہوتی تھی یا کوئی اور خوشی کا موقع تو ہم ان کے گھر کچھ نہ کچھ تحفہ بھیجتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ سب ختم ہو گیا۔ اب اس پورے محلے میں کوئی ایک بھی غیر مسلم نہیں رہا۔ سارے کے سارے ملک چھوڑ گئے ہیں۔ اور اب اس محلے کے اندر صرف اور صرف ایک ہی قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ سارے پاکستان میں تقریباً ایسا ہی ہو گیا ہے۔ شیعہ الگ ہو گئے، سنی الگ، جو اقلیتیں رہ گئی ہیں وہ خوف کے مارے یا تو اکٹھے رہتی ہیں یا وہ اپنی شناخت کو ختم کرتے ہوئے اپنے نام تک بدل رہے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی تبدیلی آئی ہے اور کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ عدم رواداری کا آغاز کب ہوا اور اس کی وجوہات کیا ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ پہلی بڑی تبدیلی 1974ء میں آئی جب احمدیوں کو آئینی طور پر غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد مذہبیت ہمارے سماج کے اندر زیادہ سے زیادہ سموتی گئی اور ضیا الحق کے زمانے میں اس رجحان میں تیزی آتی گئی۔

اس دور میں ہر ایک کے اوپر یہ لازم کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بہتر سے بہتر مسلمان ظاہر کرے۔ اس وقت ہم قائداعظم یونیورسٹی کے ایک دفتر میں بیٹھے ہیں۔ 1981ء میں یہ حکم آیا کہ ڈیپارٹمنٹ کا چیئرمین ظہر کی نماز پڑھائے گا۔ اس لئے یہاں ہر روز صفیں باندھی جاتی تھیں۔ اس وقت عام سٹوڈنٹس اور اساتذہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی تھی۔ اور اوپر سے مسلط کئے جانے والے حکم کے خلاف لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اوپر سے کسی حکم کے صادر ہونے کی ضرورت نہیں رہی۔ کچھ وقت کے بعد لوگ خود ہی شریک ہونے لگے لہٰذا کمروں کے اندر درس ہونے لگے۔ حالانکہ اس یونیورسٹی میں چار مساجد ہیں لیکن ہر ڈیپارٹمنٹ کے اندر الگ سے چھوٹی چھوٹی مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ تو جو چیز پہلے ہم پر تھوپی گئی تھی وہ اب ہمارے اندر رچ بس گئی ہے۔

اب کیونکہ ہماری قومی زندگی کے اندر مذہب کا عمل دخل پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھ گیا ہے تو ہر ایک مسئلہ کو صرف مذہب ہی کے نقطہ نظر سے دیکھا اور پرکھا جا رہا ہے اور صرف اسی زاویے سے درست اور غلط کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ انسان دوستی، انسانی حقوق اور انسانی اقدار کو مغربیت کا فریب کہتے ہوئے ہم مسترد کرتے ہیں۔

آپ کا اصل سوال یہ تھا کہ پاکستان میں انتہا پسندی کیوں بڑھ گئی ہے۔ اس کا جواب آپ کو ہندوستان کے موجودہ حالات دیکھ کر مل سکتا ہے۔ دونوں ملکوں کا موازنہ کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ پچھلے دنوں مردان یونیورسٹی میں ایک نوجوان پر کسی نے انگلی اٹھائی اور کہا کہ یہ گستاخ ہے اور گستاخی ہم برداشت نہیں کرتے۔ پھر بیس پچیس سٹوڈنٹس نے پہلے اس کو ننگا کیا پھر اس کو لاٹھیوں اور اینٹوں سے مارا اور اس کے بعد ایک شخص نے اس پر گولی چلائی۔ سٹوڈنٹس نے اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ کوئی اس شخص کا نام نہیں بتائے گا جس نے گولی چلائی تھی۔
آپ اس واقعے کا مقابلہ ہندوستان میں ایک حالیہ واقعے سے کریں۔ وہاں پہلو خان نامی شخص تھا جس پر کسی نے انگلی اٹھا کر اشارہ کیا تھا کہ یہ گائے سمگل کرتا ہے۔ گائے کو ذبح کرنے کے ارادے سے ادھر سے ادھر لے جاتا ہے۔ تو پھر وہاں پر بغیر کسی ثبوت کے سینکڑوں گاؤ رکھشک اس کے پیچھے پڑ گئے اور مار مار کر اس کو ہلاک کر دیا اور اس کی ویڈیو بھی بنائی جیسا کہ مشال خان کی ویڈیو بنائی گئی تھی۔

ہندوستان میں بھی اب وہی جنونی کیفیت پیدا ہو رہی ہے جو پاکستان میں پچھلے تیس سال سے ہے۔ ادھر بھی مذہبی جذبہ ابھارا گیا ہے اور اسی طرح کی ذہن سازی کی جا رہی ہے۔ ہم ان سے کچھ آگے ہیں مگر وہ بھی شاید ہمارے برابر کسی دن آ کر ٹھہر جائیں گے۔

تو مختصر یہ کہ جس سماج کے اندر ہر چیز کا دارومدار مذہب پر ہو، وہاں لوگوں کے اندر ایک تعصب اور تنگ نظری کا پیدا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مشال خان صرف ایک مثال ہے، ان گنت مثالیں ایسی پہلے رہی ہیں اور اس کے بعد بھی ہوں گی۔ مشال خان کے بعد دو اسی طرح کے واقعات ہوئے ہیں۔ ایک وہ واقعہ ہے جس میں تین برقعہ پوش لڑکیوں نے ایک شخص کو ہلاک کر دیا۔ اس پر یہ الزام تھا کہ تیرہ سال پہلے اس نے کوئی غلط بات کی تھی۔ پھر جو ایک باؤلا سا آدمی تھا جس نے مسجد میں جا کر کوئی بکواس کی۔ اگر اس مسجد کے امام نے اس کو نہ بچایا ہوتا تو لوگ اسے چیر پھاڑ کر ختم کر دیتے۔ اور پھر کیونکہ اس بچارے امام نے اس دیوانے کو بچایا تھا تو ایک مشتعل ہجوم نے اس کی گاڑی جلا دی۔

یہ واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ انتہا پسندوں کا صرف کوئی ایک ٹولہ نہیں ہے۔ یہ خرابی اب ہمارے سماج کے اندر ہر طرف رچ بس گئی ہے۔

عدنان کاکڑ: انڈیا میں تو کوئی ضیاء الحق نہیں آیا۔ ادھر یہ انتہا پسندی کیوں آ گئی ہے؟

فرنود عالم: اس سوال کو میں آگے بڑھا رہا ہوں۔ ترکی کو اگر ہم دیکھیں تو وہاں بھی مذہبی ذہن جو ہے وہ غالب آ رہا ہے۔ پڑوس میں ہم نے ہندوستان میں دیکھا وہاں پر ہندتوا کی مہم چلی ہوئی ہے۔ امریکہ میں ہم نے دیکھا ٹرمپ

تشریف لے آئے ہیں۔ یہ جو پوری دنیا میں ایک ہوا چلی ہے اس کو آپ کس طرح سے دیکھتے ہیں۔ جنرل ضیاء تو ہندوستان میں نہیں تھے۔ وہ ترکی میں بھی نہیں تھے وہاں تو مصطفیٰ کمال اتاترک تھے۔ امریکہ میں بھی نہیں تھے۔ تو یہ چیزیں وہاں کیسے ہوگئیں۔ کیا وجہ تھی؟

پرویز ہود بھائی: آپ کی بات بالکل درست ہے۔ دنیا کے ہر کونے کھدرے میں مذہبی طاقتیں زور پکڑ رہی ہیں اور یہ صورت حال امریکہ میں بھی نظر آتی ہے۔ دو ہفتہ پہلے میں امریکا کی ریاست میسوری گیا تھا جہاں ٹرمپ کو 70 فیصد سے زیادہ لوگوں نے ووٹ ڈالا تھا۔ اس کے ایک چھوٹے سے شہر میں جو آپ سمجھ لیں کہ گوجرانوالہ کے برابر کا ہے، 350 کے قریب گرجا گھر ہیں۔ ہر محلے میں، ہر گلی میں گرجا گھر ہے اور لوگ اپنی شناخت کسی ایک مخصوص چرچ کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ گویا امریکا میں بھی مذہبیت کا رجحان زور پکڑ رہا ہے۔

پھر سری لنکا جیسے ملک پر ایک نظر ڈالیں۔ کسی زمانے میں یہ امن و آشتی کا گہوارہ ہوتا تھا۔ اور بدھ مت ایک نہایت پرامن مذہب کے طور پر مشہور تھا۔ لیکن اب اسی ملک کے مسلمان اور ہندو خوفزدہ ہیں۔ اسی طرح روہنگیا مسلمان ظلم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ جہاں جہاں مذہبی قوتیں سیاست کے میدان میں اتر آئی ہیں، وہاں وہاں اقلیتوں کو خوب روندا گیا ہے اور انتہا پسندی پورے سماج میں سرائیت کر گئی ہے۔ لہذا آپ کے سوال کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ میرا مدعا یہ ہے کہ قدامت پسندی کا موجودہ رجحان سائنس اور جدیدیت کے خلاف ایک ردعمل کے نتیجہ میں ہے۔

سائنس کی وجہ سے اب دنیا بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔ سائنس سے ہم نے ایٹم کا کھوج لگایا ہے، خلا میں ہم دوسرے سیاروں کی طرف نکل پڑے ہیں۔ سائنس کی مدد سے ہم نے یہ بھی جان لیا ہے کہ انسانی ساخت ایسی کیوں ہے اور ویسی کیوں نہیں ہے۔ سائنس اب ہمارے اوپر اس طرح سے حاوی ہوگئی ہے کہ انسان ہر طرف پریشان ہوگئے ہیں کیونکہ ان کو اب یوں لگ رہا ہے کہ جیسا کہ فطرت کی اندھی طاقتیں ہمیں اب چلا رہی ہیں اور جو پرانے مذاہب کے عالم ہیں وہ اب کسی بڑے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے۔ انسانوں کے اندر اس تیز تغیر اور تبدیلی کی وجہ سے ایک عجیب خوف پیدا ہوگیا ہے۔

تقریباً پچاس برس پہلے ایلون ٹافلر (Alvin Toffler) نامی ایک مصنف اور محقق نے ایک کتاب لکھی تھی، فیوچر شاک (Future Shock) جس میں انہوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ کیونکہ سائنس نے اب دنیا کو اتنی تیزی سے بدلنا شروع کر دیا ہے تو اس لئے انسان کا ذہن پریشانیوں اور نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس کو سمجھ میں نہیں آئے گا کہ وہ اس سمت جائے یا اُس سمت۔ اس لئے کہ جس طرح سے اس کے آباواجداد رہتے تھے، جو ماحول ان کا تھا، آج کا ماحول اس سے یکسر مختلف ہے۔ لہذا اپنی زندگی پر قابو پانے کے لئے اور اس میں استحکام پیدا کرنے کی خاطر لوگ اپنی روایات کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں کہ اگر یہ ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گئیں تو پھر ہماری بنیادیں بھی ختم ہو جائیں گی۔ جو لوگ سائنس سے ناواقف ہیں وہ اس بے جا خوف کا خاص طور ہر شکار بنتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ

گلوبلائزیشن کے نتیجہ میں امیر اور غریب کا فرق بے تحاشا بڑھ گیا ہے۔غریب طبقہ بے آسرا ہوتا جارہا ہے اور اس لئے وہ قدیم روایات اور دینی احکامات کا سہارا لیتا ہے۔اور کوئی اور چارہ دکھائی نہیں دیتا۔

یہی وجہ ہے کہ آج سائنس کے خلاف ایک وسیع پیمانے پر خوف اور نفرت پائی جاتی ہے۔اب دو دن پہلے آپ نے دیکھا ہوگا کہ سائنسدانوں نے امریکہ اور یورپ میں سائنس کے دفاع میں ایک مارچ کیا تھا۔حیرت ہوتی ہے کہ ان ملکوں میں جہاں سائنس سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، جہاں سائنس کا جنم ہوا تھا، وہاں پر اب سائنسدانوں کو سائنس کے دفاع میں سڑکوں پر نکل آنا پڑا ہے۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نہ صرف ہندوستان، پاکستان، سری لنکا اور ایشیا میں بلکہ پوری دنیا میں ہی ایک پریشانی سی ہے۔

مذہب کو استعمال کرنے والی طاقتوں نے اس پریشانی سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔وہ یہ دعوی کرتی ہیں کہ ہمارے پاس ہر مسئلے کا جواب ہے۔ہم تمہیں بتا سکتے ہیں کہ مقصد حیات کیا ہے۔ہم تمہاری عاقبت سنوار سکتے ہیں۔قدامت پرستی کے احیا کے پیچھے محرکات دراصل نفسیاتی ہیں، معروضی نہیں۔

عدنان کاکڑ: ایک تو بقا کا خوف ہوگیا۔اب اس میں برطانیہ کے یورپی یونین سے اخراج یعنی بریگزٹ (Brexit) کا تو سمجھ آتا ہے کہ اس نے بریگزٹ مشرقی یورپ کے خلاف کیا۔لیکن باقی ساری دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو مسلمان ہیں جو مار رہے ہیں یا مر رہے ہیں اور دوسری سائیڈ پر غیر مسلم ہیں۔تو اس میں آپ تہذیبوں کے ٹکراؤ کا عنصر بھی دیکھتے ہیں؟

پرویز ہود بھائی: ہاں تہذیبیں آپس میں ٹکرانے لگی ہیں لیکن تہذیبوں کے اندر بھی تصادم کی شدت بہت بڑھ گئی ہے۔آج جتنا مسلمان کا خون دوسرے مسلمانوں کے ہاتھوں بہہ رہا ہے، ماضی میں ایسا کبھی نہیں تھا۔ہر طرف پرانے زخم کھولے جارہے ہیں۔اور 1400 سال پہلے کی جنگیں اب پھر سے لڑی جارہی ہیں۔ہر طرف لوگ ماضی کی پرستش کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

سرحد کے اس پار ہم دیکھتے ہیں کہ مودی اور بی جے پی کے کارسیوک اپنے قدیم زمانے کو سب سے اچھا اور سنہرا دور سمجھتے ہیں اور اس کے بارے میں بڑھا چڑھا کر بتاتے ہیں مثلاً یہ کہ ہند کے لوگوں کے پاس ہزاروں برس پہلے ایسے خلائی جہاز تھے جو آپ کو زمین سے مریخ اور مریخ سے عطارد لے جاتے تھے۔جو پہلی پلاسٹک سرجری ہوئی تھی وہ گنیش کی تھی۔گنیش کی سونڈ پلاسٹک سرجری سے ادھر سے ادھر کی گئی تھی، وغیرہ۔مگر یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ اب ہندوستان میں بھی بہت سے لوگ قدیم زمانوں کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں۔

جدید زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلنا نفسیاتی طور پر اکثر لوگوں کے لئے بہت مشکل ہوگیا ہے لہذا وہ ماضی کا سہارا لیتے ہیں۔اس طرح وہ قبائلیت اور اجتماعیت کی طرف جاتے ہیں۔قبائلیت میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون کس قبیلے کا ہے۔آپ کا رشتہ صرف اس فرد کے ساتھ

جڑے گا جو آپ کے قبیلے کا ہے یا اس سے نزدیک والے قبیلے کا ہے۔ لہذا عالمگیریت یا انسان کو انسان کے طور پر پہچاننا کم ہو گیا ہے۔

عالمگیریت کا نظریہ اس فکری انقلاب سے نکلا تھا جو یورپ میں آج سے تین سو سال پہلے برپا ہوا۔ وہ روشن خیالی کا دور تھا۔ تین صدیوں کے بعد اس کے خلاف ایک ردعمل پیدا ہوا ہے جسے آپ امریکہ اور یورپ میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لوگ سائنس اور جدیدیت سے نفسیاتی طور پر بہت پریشان ہیں۔ ٹرمپ جیسے لیڈر جو سائنسی تعلیم سے نابلد ہیں، ایسی تحریکوں کی قیادت کرتے ہیں۔

عدنان کاکڑ: یونیورسٹیوں میں یہ انتہا پسندی آ رہی ہے۔ صفورا گوٹھ کے مجرم آئی بی اے کے گریجویٹ تھے۔ مشال خان کا واقعہ ہوا ہے۔ کیا یونیورسٹی بھی روشن خیالی سے، نئی سوچ سے گھبرا رہی ہے؟ اس کا حل کیا ہے کہ اس کا خوف دور کیا جائے؟ کیا نصاب میں تبدیلی کی جائے یا کچھ اور کیا جائے؟

پرویز ہود بھائی: یہ بہت اچھا سوال ہے۔ امریکہ، یورپ اور انڈیا میں انتہا پسندی تو ضرور بڑھی ہے لیکن وہ صرف عام لوگوں میں بڑھی ہے۔ جو طلبا یونیورسٹی اور کالج میں پڑھتے ہیں۔ ان کی بھاری اکثریت اب بھی روشن خیال ہے اور وہ وسیع ذہن رکھتے ہیں۔ اب بھی وہاں تعصب آپ کو شاذ و نادر ہی نظر آئے گا۔ ان یونیورسٹیوں میں تقریباً ہر قسم کی بات کی جا سکتی ہے اور وہاں حاکم وقت کی کھل کر مخالفت بھی ہوتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے کے طالب علموں نے ٹرمپ کے حامیوں کو برکلے یونیورسٹی میں آنے سے روک دیا تھا۔ یونیورسٹی کے باہر سے ٹرمپ کے حامی ہنگامہ کرنے کے لئے آ رہے تھے لیکن سٹوڈنٹس نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ قانونی طور پر اس چیز کو روکا گیا، یہ نہیں کہ دھینگا مشتی ہوئی۔ جب ٹرمپ نے امریکا میں مسلمانوں کی آمد ہر پابندی عائد کی تھی تو امریکا کی یونیورسٹیوں میں بڑے پیمانے پر احتجاج ہوئے تھے۔ اسی طرح انڈیا میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی جیسے اداروں میں ہر قسم کی سیاسی سوچ کا اظہار ہوتا ہے۔ وہاں مسلمان اپنی بات کرتے ہیں، کمیونسٹ پارٹی بھی ہے اور بی جے پی والے بھی اپنی بات کرتے ہیں، وہ ایک کھلا ماحول ہے۔ ان تعلیمی اداروں میں آپ کو انتہا پسندی نہیں دکھائی دیتی ہے۔

اس کے برعکس پاکستان کی یونیورسٹیاں اور پاکستان کے دیگر تعلیمی ادارے فکری لحاظ سے بند ہیں۔ یہاں سوچ بچار اور غور و فکر پر پہرے بٹھائے گئے ہیں۔ پہریدار صرف انتظامیہ نہیں، صرف اساتذہ نہیں، یہاں پہریداروں میں خود طالب علم شامل ہیں۔ آپ نے یہ دیکھا کہ مردان یونیورسٹی میں کیا ہوا۔ مارنے والے خود سٹوڈنٹس تھے۔ اس میں سب ہی شامل تھے۔ ٹیچرز بھی تھے۔ انتظامیہ شمولیت بھی تھی۔

پاکستان کی ہر یونیورسٹی میں حالات اس سے ملتے جلتے ہیں، ہر طرف سوچ پر قدغنیں ہیں۔ اگرچہ انتہا پسندی پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے لیکن جتنی خرابی پاکستان کے اندر آ چکی ہے، جتنا تعصب، جتنی نفرتیں ہمارے اندر کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہیں، اس کا مقابلہ ہم کسی اور ملک

کے ساتھ نہیں کر سکتے۔

اس کی ایک اہم وجہ ہمارا نصاب تعلیم ہے۔ہم سکول کے نصاب میں دوسرے مذاہب کو برا بھلا کہتے ہیں،اور ہم اس پر مصر ہیں کہ ہر چیز کو صرف دینی نقطہ نظر سے دیکھا جائے،ہم نصاب میں مذہبی عصبیت پڑھاتے ہیں۔تو پھر کیا تعجب ہے کہ دو لاکھ لوگ ممتاز قادری کے جنازے میں شریک ہوئے؟

تو یہ انتہا پسندی کا ماحول ہم نے خود پیدا کیا ہے۔مگر کیونکہ اپنے آپ کو مجرم ماننے کی بات ہم سے برداشت نہیں ہوتی،اس لئے ہم کسی دوسرے ملک کے اوپر انگلی اٹھانے کے لئے دوڑتے ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ دہشت گرد تو افغانستان سے آئے،یا انڈیا سے آئے یا نہ جانے مریخ سے ٹپک پڑے،ہم اس لے ذمہ دار نہیں ہیں۔کیونکہ ہم حقیقت سے انکار کرتے رہے ہیں لہذا ہم اس کا کوئی تدارک بھی نہیں کر سکے۔ہم فضول قسم کے،بے اثر قسم کے اقدامات کرتے ہیں،ہم نیکٹا بناتے ہیں،ہم نیشنل ایکشن پلان بناتے ہیں لیکن ان کے اوپر عمل اس لئے نہیں ہو سکا ہے کہ ہم یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ خرابی ہمارے اپنے اندر ہے اور یہ کہ انتہا پسند ہمارے تعلیمی اداروں میں بنتے ہیں، ہمارے مدارس میں پیدا ہوتے ہیں،اور انتہا پسندوں کو پیدا کرنے میں سب سے بڑا کردار تو ہمارے میڈیا اور ریاست کا ہے جو انتہا پسندوں کی گرفت میں ہے۔

عدنان کاکڑ: انتہا پسندی کو ختم کرنے کے لئے کیا اقدامات آپ تجویز کریں گے؟

پرویز ہود بھائی: کئی سارے۔ایک تو میڈیا میں نفرت انگیز مواد پر سختی سے پابندی لگانے کی ضرورت ہے۔وہ اینکر جو کسی اور فرقے، کسی اور مذہب،کسی اور ملک کے خلاف نفرتیں بھڑکاتے ہیں،انہیں نہ صرف ٹی وی پر آنے سے روکا جائے بلکہ ان کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی جائے۔

پھر ہمارے نصاب میں ترمیم کی از حد ضرورت ہے۔اس میں جو نفرت کی پڑیاں تیار کی گئی ہیں اور جو پھر ہم بچوں کو کھلاتے ہیں،اس کا انجام ذہنی مریض پیدا کرنا ہے۔ایسے طلبہ انتہا پسندی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔پھر کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب وہ خودکش حملہ آور بن کر اپنے آپ کو پھاڑتے ہیں یا کلاشنکوف اٹھا کر قتل عام کرتے ہیں۔یہ تو تعلیم کے میدان میں تجویز تھی لیکن ہر شعبے میں اصلاحات کی شدید ضرورت ہے۔

فرنود عالم: آئینی حوالے سے آپ کیا تجاویز دیں گے؟

پرویز ہود بھائی: پاکستان کے آئین میں مسلم اور غیر مسلم میں تفریق کی گئی ہے۔اس آئین میں غیر مسلموں کو ایک ثانوی حیثیت ملی ہے۔وہ سیکنڈ یا تھرڈ کلاس شہری ہیں۔لہذا وہ پاکستان کے ساتھ ویسی محبت کر ہی نہیں سکتے جو دوسرے کرتے ہیں۔اس چیز کو بدلنے کی

ضرورت ہے۔

انتہا پسندی صرف ایک قانونی مسئلہ نہیں، یہ سماج کے مخصوص اقتصادی اور سیاسی حالات سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ دیکھ لیجیے کہ ہماری خارجہ پالیسی کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ہندوستان ہمیشہ ہمارا دشمن رہے گا۔ چنانچہ ہم پر پھر یہ لازم ہے کہ ہم ہر طریقے سے اس کو نقصان پہنچائیں۔ جب افغان جنگ ختم ہوئی تو ہم نے مجاہدین سے شکریہ کہہ کر ان سے یہ نہیں کہا کہ بس اب چلے جاو؟۔ ہم نے ان کو اپنے کام کے لئے استعمال کیا۔ ان کو کشمیر بھیجا جہاں درجنوں ایسی تنظیمیں اکھٹی کی گئیں جن کا کام صرف یہ تھا کہ سرحد پار یا لائن آف کنٹرول کے پار جا کر ہندوستان پر حملہ کریں۔

ہم نے طالبان کو بھی استعمال کیا تا کہ وہ افغانستان میں جا کر ہمارے لئے سٹریٹیجک ڈیپتھ قائم کریں اور یوں افغانستان ہمارے گھر کا پچھواڑا بنے۔ لیکن طالبان کا ایک دھڑا ہمارے گلے پڑ گیا۔ نائن الیون کے بعد۔ پاکستان کے اندر جو خانہ جنگی کی صورت بنی وہ آج تک ختم نہیں ہوئی ہے۔ اب ہماری فوج، ہماری پولیس اور ہمارے عام شہریوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے اس کے پیچھے ہماری ناکام خارجہ پالیسی ہے

اس خارجہ پالیسی پر عمل کرنا تھوڑا سا مشکل ہو گیا ہے کیونکہ انڈیا کے بارڈر پر باڑ ہے جسے پار کرنا زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ مگر ہماری سوچ میں فرق اب تک نہیں آیا ہے اور جب تک ہم اپنی خارجہ پالیسی کو نہیں بدلتے۔ اس وقت تک ہم دہشت گردی سے نجات نہیں پا سکیں گے۔

عدنان کاکڑ: غامدی صاحب کی ایک تجویز آئی تھی کہ دسویں بارہویں تک تمام طلبا ایک ہی نظام سے تعلیم حاصل کریں تا کہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں اور ایک دوسرے کو سمجھیں۔ اس کے بعد ہی جیسے سائنس یا دوسری سپیشلائزیشن منتخب کی جاتی ہے ویسے ہی مذہبی سپیشلائزیشن بھی کی جائے۔ اس پر آپ کے کیا کمنٹس ہیں۔

پرویز ہود بھائی: میں سمجھتا ہوں کہ دینیات کے معاملے پر یہ تجویز نہایت ہی معقول ہے، ایسا ہی ہونا چاہیے، آخر اسی طرح سے مسلمانوں میں وہ برداشت کی صلاحیت پیدا ہو گی کہ وہ جانیں کہ سبھی ایک ہی نماز پڑھتے ہیں، ایک ہی قرآن پڑھتے ہیں، جو فرق ہیں ان پر بعد میں بات کی جا سکتی ہے۔ اعلی تعلیم کے اداروں میں ان مسائل پر تحقیق ہو سکتی ہے۔ ان پر بحث مباحثہ ہو سکتا ہے۔ غامدی صاحب یہ فرما رہے ہیں کہ اگر پاکستان کو ایک مسلمان ملک تصور کرنا ہے تو پھر مسلمانوں کے لئے ایک مشترکہ نصاب ہونا چاہیے۔ جو غیر مسلم ہیں ان کو مکمل طور پر اس سے مستثنی ہونا چاہیے۔ ان غیر مسلموں پر اسلامی تعلیمات تھوپنا ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ ہم یقیناً اس کو بہت برا کہتے اگر کوئی بچہ انگلینڈ میں ہوتا اور اس کو زبردستی بائبل یا تورات پڑھایا جاتا۔

غامدی صاحب کی تجویز اچھی تو ہے لیکن ملک کے جو اس وقت حالات ہیں ان کو دیکھتے ہوئے اس کا قبول ہونا مشکل نظر آتا ہے۔

عدنان کاکڑ: ایک چیز ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلاسفیمی کو ہر مقصد کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ ہے۔ ادھر مشال

خان کے کیس میں یونیورسٹی انتظامیہ نے اپنے بچاؤ کے لئے مبینہ طور پر اسے استعمال کیا۔ادھر کشمیر اسمبلی میں حزب اختلاف نے حکومتی قراردار پھاڑی تو حکومتی اراکین نے الزام لگایا کہ انہوں نے بلاسفیمی کی ہے۔باقی معاملات میں صحافی عفت حسن رضوی کا جو کیس تھا کہ عمران خان صاحب کی جوانہوں نے پھٹیچر والی ویڈیو ریلیز کی تھی اس پران کو گستاخ پیجز کا ایڈمن مشہور کر دیا گیا۔بلاسفیمی لاکو تو تمام ملکی اور بین الاقوامی پریشر کے باوجود ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔کیا اس میں ایسی تبدیلی کی جانی چاہیے کہ غلط الزام لگانے والے کو بھی کڑی سزا دی جائے؟

فرنود عالم: کراچی یونیورسٹی میں ڈاکٹر ریاض صاحب کی مثال ہے جن پر گستاخی کا الزام لگایا گیا۔اس کے علاوہ ہولی کی تقریب میں میاں نواز شریف کی تقریر کے بعد باقاعدہ رات کے شوز میں کہا گیا کہ کہ نواز شریف صاحب نے جو بات کی کہ ہمارا اوران کا خدا ایک ہی ہے تو ان پر وہی 295 سی کا کیس لگانا چاہیے۔تو یہ جو سلسلہ چل پڑا ہے۔جو اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ بس یہ۔۔۔

پرویز ہود بھائی: اس کی کئی اور مثالیں بھی ہیں۔آپ کو یاد ہوگا کہ ایم کیو ایم پر بھی الزام لگا تھا بلاسفیمی کا کیونکہ وہ اپنے آپ کو مہاجر کہتے ہیں جبکہ اصل مہاجر تو وہ تھے جنہوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی۔لہذا بعض لوگوں کے نزدیک یہ قانون ایک حربہ ہے جس سے وہ اپنے مخالفین کو زیر کر سکتے ہیں۔اگر آپ کسی کی جائیداد چھیننا چاہتے ہیں،اس کی زمیں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں،یا پھر اس کی بیٹی کو اغوا کرنا چاہتے ہیں تو اس پر صرف انگلی اٹھانے کی ضرورت ہے۔اپنے حریف کو گستاخ کہو،منٹوں کے اندر ایک ہجوم جمع ہو جائے گا،اس شخص کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑے گا،اگر کامیاب ہوا تو جان بچ گئی لیکن ملکیت چلی گئی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنا زیادہ زور توہین مذہب پر آج کل ہی کیوں دیا جا رہا ہے۔آخر اس خطے میں مسلمان تو ہزار سال سے رہ رہے ہیں۔یوں لگتا ہے کہ کوئی بلاسفیمی بم اچانک پھٹا ہے اور پورا ملک اس کی زد میں آ گیا ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مذہبی طاقتوں کو کوئی ایسا نکتہ چاہیے جس کے گرد وہ عام لوگوں کو جمع کر سکیں۔اب یہ دیکھ لیجیے کہ کوئی مسلمان اپنے مذہب کی ہتک برداشت نہیں کرتا۔جن پر گستاخی کا الزام لگایا گیا ہے ان میں سے اکثر بے قصور ہوتے ہیں لیکن سادہ لوگوں کو مشتعل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

وہ یہ نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے استعمال کیا جا رہا ہے اور الزام لگانے کے پیچھے محرکات کیا ہیں۔

ہندوستان میں گائے کے ایشو کے بارے میں عین یہی بات کی جا سکتی ہے۔ہندو گائے کو نہایت مقدس سمجھتے ہیں اور اگر آپ ہندوؤں کو مشتعل کرنا چاہیں تو گائے کا مسئلہ چھیڑ دیں۔آخر ادھر کے عام لوگ بھی بڑے سادہ ہیں۔عام لوگ ہر جگہ بہت سادہ ہوتے ہیں۔انہیں

استعمال کیا جا سکتا ہے۔اور وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے دوررس نتائج کیا ہوں گے۔تو آج ہندوستان میں وہی جنونیت دکھائی دے رہی ہے جو پاکستان میں عرصے سے ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں ممالک کے جو جو چالاک لوگ ہیں انہوں نے جان لیا ہے کہ عوام کو کیسے جوڑا جا سکتا ہے اور ان میں کیسے اشتعال پیدا کیا جا سکتا ہے۔

اس گھمبیر مسئلہ کا حل کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ صرف اور صرف تنقیدی سوچ کو اپنانے ہی سے ایک صحت منداور پرامن معاشرہ بن سکتا ہے۔ ایسی سوچ جو ہر وقت سوال کرے، جو پوچھے کہ آخر ایسا کیوں ہے اور ویسا کیوں نہیں ہے۔جو کوئی بات قبول کرنے سے پہلے ثبوت مانگے اور جو دلیل، استدلال اور مشاہدے پر اصرار کرے۔مختصر یہ کہ ہمیں اپنی قومی زندگی میں سائنسی طریقہ کار اپنانا ہوگا۔بصورت دیگر، سادہ لوگوں کو استعمال کرنا آسان سے آسان تر ہوتا جائے گا۔

عدنان کاکڑ: یعنی سکول میں ابتدائی سطح پر ہمیں ایک بنیادی تبدیلی کرنی ہوگی۔ بچے کو سوچنا سکھایا جائے۔یعنی اسے یہ نہ کہا جائے کہ ہم نے تمہیں یہ نظریہ دے دیا ہے، تم نے اسی کو فالو کرنا ہے، اپنا دماغ استعمال نہیں کرنا ہے۔

پرویز ہود بھائی: بالکل صحیح بات۔چھوٹے بچوں کو اس طرف لانا قدرے آسان ہے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو تھوڑا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔مزید بڑے ہوتے ہیں تو ذہن پختہ ہونے لگتے ہیں۔جب وہ یونیورسٹی میں پہنچ چکے ہوتے ہیں تو پھر شاذ و نادر ایسے طلبا ہیں جن کی سوچ بدلی جا سکتی ہے۔

(بشکریہ: ہم سب www.HumSub.com.pk)